'تعبیر' اور عمل سے وابستہ چند یادیں

افتخار گیلانی

مولانا وحیدالدین خان مرحوم کے حوالے سے ذاتی یادوں اور مشاہدات کا ایک سلسلہ ہے۔ نئی دہلی میں ۳۰ برسوں پر پھیلے قیام کے دوران مجھے، مولانا سے کبھی بالمشافہ گفتگو کرنے اور کبھی ان کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا۔ اس طالب علمانہ ربط و تعلق سے متعلق چند واقعات کا ریکارڈ پر آنا ضروری ہے۔ مولانا وحیدالدین خان بلاشبہہ ایک قابلِ ذکر شخصیت تھے۔ میں زمانہ طالب علمی سے ہی ان کے ماہنامہ الرسالہ کا قاری رہا ہوں۔ اپنے نقطۂ نظر کو جس سہل، نپے تلے، منفرد اور سائنسی انداز میں وہ مشکل ترین موضوعات کو قارئین کے دماغ میں اُتارتے تھے، وہ انھی کا خاصہ تھا۔

مولانا صاحب سے میری پہلی ملاقات ۹۰ کے عشرے میں ہوئی، جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی وارد ہوا۔ نظام الدین ویسٹ میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کا دفتر تھا۔ میں کسی کام سے دفتر گیا تھا تو وہاں پر پونا یونی ورسٹی شعبۂ صحافت کے ایک طالب علم عبدالباری مسعود، (آج کل ایک معروف صحافی) سے ملاقات ہوئی۔ ابتدائی تعارف کے بعد، انھوں نے بتایا کہ ''مولانا وحیدالدین خان صاحب سے ملاقات کے لیے آج کا وقت طے ہے''۔ میں بھی خان صاحب کو بالمشافہ دیکھنے کے شوق میں ان کے تین رکنی قافلے میں شامل ہوگیا۔ ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہ مسند لگائے ہوئے تھے، اور سامنے ڈیسک پر کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ پورے کمرے میں کتابیں، قومی اور بین الاقوامی جریدے ترتیب کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔

ابتدائی نوعیت کا تعارف ختم ہوتے ہی اچانک خود انھوں نے عبدالباری صاحب سے سوال کیا کہ ''آخر آپ کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''میں الرسالہ کا قاری اور

آپ سے متاثر ہوں'۔اس پر انھوں نے فوراً یہ سوال پوچھا کہ ''الرسالہ میں کون سی بات آپ کو اچھی لگتی ہے، اور کس نے آپ کو متاثر کیا ہے؟'' ابھی ان کی جانب سے تفتیش کا سلسلہ جاری تھا کہ تبلیغی مرکز سے ایک وفد کمرے میں داخل ہوا، تو ہمیں دم لینے کا موقع ملا۔ وہ وفد بھی مہاراشٹرا سے تعلق رکھتا تھا اور ان کو کسی پروگرام میں شرکت کی دعوت دینے آیا تھا۔ اس لیے گفتگو اب تبلیغ اور اس کے طریق کار کی طرف مڑ گئی۔

ان دنوں 'بابری مسجد کمیٹی' اور اس کے روح رواں سید شہاب الدین [۱۹۳۵ء- ۲۰۱۷ء]، مولانا صاحب کے نشانے پر ہوا کرتے تھے۔ اس ملاقات میں بھی انھوں نے شہاب الدین صاحب پر بھرپور وار کیے اور بتایا کہ ''علامہ اقبال [م:۱۹۳۸ء] کی طرح شہاب الدین بھی مسلمانوں کا استحصال کرنے پر تلے ہوئے ہیں''۔ اس پہلی ملاقات میں ہی مجھے یہ انداز ہو گیا تھا کہ وسعت علم کے باوجود وہ ایک طرح کے 'معلوماتی تکبر' (Information Arrogance) کا شکار ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلدوں اور ٹائم، نیوز ویک رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''الرسالہ کی تیاری کے لیے ان سبھی بیش قیمت کتابوں و رسائل کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور اس میں زر کثیر خرچ ہوتا ہے''۔

اس ملاقات کے بعد بھی اپنی صحافتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران ان سے متعدد بار ملنا ہوا۔ نمازِ عصر کے بعد وہ اپنے اسی کمرے میں ملتے تھے یا اتوار کے روز صبح ان کا درس ہوتا تھا، جو نمازِ ظہر پر ختم ہوتا تھا۔ یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار درس کے دوران انھوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہونے والی فتوحات پر نکتہ چینی کی۔ ان کا استدلال تھا کہ ''اُن فتوحات کی وجہ سے دعوت کا کام دب گیا''۔ اسی طرح ان کی ایک دلیل یہ تھی: ''صلاح الدین ایوبی اور صلیبی جنگوں کی وجہ سے یورپ میں اسلام کے دعوتی پیغام کو نقصان پہنچا''۔ عراق اور افغانستان میں امریکا اور ناٹو افواج کی جانب سے مسلط کردہ خونیں جنگ کو وہ 'خدائی آپریشن' کا نام دیتے تھے۔

بھارت میں ہندو مسلم فسادات ہوتے، تو وہ اس میں مسلمانوں کو ظالم قرار دیتے تھے۔ معلوم نہیں کس ذریعے سے حاصل کردہ اطلاعات کی بنیاد پر ان کا کہنا ہوتا تھا: ''فسادات کی ابتدا مسلمان کرتے ہیں''۔ یہ بات سنتے ہوئے میں نے ایک بار ہمت کر کے ان سے پوچھا کہ ''یہ نتیجہ

آپ نے کہاں سے اخذ کیا ہے؟ سوال پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے کئی بار فسادات کی کوریج کرنے کا موقع ملا ہے اور میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ جانی اور مالی نقصان مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔ آخر اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے کیوں کوئی اپنا سر آگ میں جھونکے گا؟'' اسی طرح ان کا موقف تھا کہ ''بابری مسجد سے مسلمانوں کو دست بردار ہونا چاہیے، اور وہاں پر ایک عالی شان رام مندر بنانے میں معاونت کرنی چاہیے''۔ خان صاحب کی اس تجویز یا خواہش کے مطابق اب تو اس جگہ پر رام مندر کی تعمیر ہو رہی ہے۔ لیکن کیا اس سے قوم پرست ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت میں کمی واقع ہوئی ہے؟ بلکہ وہ تو اب شیر ہوکر دیگر مساجد کو بھی مندر بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

کشمیری مسلمانوں کے ساتھ تو سچ پوچھیے خان صاحب کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''بجائے آزادی کی تحریک کے، ان کو اپنے کردار و تبلیغ سے وہاں موجود سات لاکھ بھارتی فوجیوں اور نیم فوجی دستوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا چاہیے''۔ یاد رہے، خان صاحب کے رسالے الرسالہ کی سب سے زیادہ فروخت کشمیر میں ہی ہوتی تھی۔ بلاشبہہ کچھ لوگ تو واقعی خریدتے تھے، مگر کشمیریوں کے گھروں کی تلاشی آپریشنوں کے دوران بھارتی فوج اور نیم فوجی دستوں کے ساتھ آئے ہوئے انٹیلی جنس کے افراد اس رسالے کو نوجوانوں میں بانٹتے بھی تھے۔ سوپور کی جامع مسجد کے پاس بارڈر سکیورٹی فورس کا بینکر تھا۔ ایک روز نماز جمعہ سے قبل مسجد میں داخل ہونے والوں کو بینکر کا ایک سپاہی الرسالہ اور مولانا کا ایک تحریر کردہ پمفلٹ بانٹ رہا تھا اور تاکید کر رہا تھا کہ ''اس اسلام کو اپنا کر پاکستان والا اسلام ترک کر دیں''۔ میرے لیے اس سپاہی کے ساتھ بحث کا تو کوئی موقع نہیں تھا، مگر دہلی واپس آکر میں نے یہ واقعہ براہِ راست مولانا صاحب کے گوش گزار کیا۔ انھوں نے میری اس آنکھوں دیکھی رُوداد کے جواب میں کہا: ''کشمیریوں نے میر سید علی ہمدانی کے مشن کو فراموش کر دیا ہے''۔

یہ غالباً ۲۰۱۵ء کی بات ہے کہ جموں وکشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے ایک رکن انجینئر عبدالرشید کچھ کشمیری صحافیوں کے ہمراہ دہلی آئے۔ انھوں نے مولانا صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چونکہ بطور ممبر اسمبلی وہ کشمیر میں بھارتی جمہوریت کا ایک چہرہ تھے، اسی لیے ان کا اصرار تھا کہ ''مولانا صاحب سے جموں وکشمیر کی صورت حال کے بارے میں رائے معلوم

کر کے ان کے وسیع تجربے سے کچھ مفید اور قابل عمل اقدامات کے لیے ہم رہنمائی حاصل کریں گے''۔ خیر ان کی کوٹھی پر پہنچ کر پہلے تو ہم نے درس میں شرکت کی۔ نمازِ ظہر تک مولانا کی تقریر اور سوال و جواب کا دل چسپ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مولانا صاحب نے انجینئر عبدالرشید صاحب کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور بھارتی آئین کے تحت کشمیر اسمبلی میں رکنیت حاصل کرنے پر ان کو سراہا۔ علیک سلیک کے بعد ممبر اسمبلی نے مولانا کی توجہ کشمیر کی صورت حال، خاص طور سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی جانب مبذول کراتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے پائیدار حل کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر جاننا چاہا۔ مولانا نے مسئلہ کشمیر کا صرف ایک ہی حل بتایا کہ ''کشمیری 'امن' کا راستہ اپنائیں، لیکن اس سے پہلے انھیں یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ گذشتہ کئی عشروں کے دوران ان کی جد و جہد غلط تھی''۔ عبدالرشید صاحب نے مولانا سے عرض کیا کہ ''امن کی خواہش کشمیریوں سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہوسکتی، لیکن انصاف کے بغیر امن کا قیام کیسے ممکن ہے؟'' تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ ''انصاف کو امن کے ساتھ جوڑنا آپ لوگوں کی ذہنی اختراع ہے''۔

مولانا صاحب کے بقول: ''کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق حتمی ہے اور اس کو متنازعہ کہنے والے غیر حقیقت پسند ہیں''۔ ممبر اسمبلی نے ان سے سوال کیا کہ ''جموں و کشمیر کے تنازعے کو تو خود بھارتی لیڈر ہی اقوام متحدہ میں لے گئے تھے، اس میں کشمیریوں کا کیا قصور ہے؟ وہ بے چارے تو صرف وعدہ پورا کرانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں''۔ یہ بات سننا تھا کہ مولانا صاحب غصّے سے لال پیلے ہوگئے اور ہال چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ منٹ انتظار کے بعد ہم بھی وہاں سے واپس چلے آئے۔

انڈین سپریم کورٹ کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں 'ہندوتوا' کو مذہب کے بجائے بھارتی کلچر کی علامت اور ایک نظریۂ زندگی قرار دینے کے پیچھے مولانا کی سوچ کارفرما تھی۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں مہاراشٹرا میں شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے [م: ۲۰۱۲ء]، منوہر جوشی [پ: ۱۹۳۷ء] اور کئی دیگر اراکین کی طرف سے انتخابی جلسوں میں ہندو ووٹروں کو لبھانے کے لیے مذہبی نعرے اور مذہبی شعار کے کھلم کھلا استعمال کرنے پر 'ری پرزنٹیشن آف دی پیپلز ایکٹ ۱۹۵۱ء' کے تحت ان کو نااہل قرار دیتے ہوئے، انتخابات لڑنے پر پابندی عائد کی گئی، جس کو بمبئی ہائی کورٹ نے درست

قرار دیا۔ لیکن جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں پہنچا، جہاں جسٹس جے ایس ورما [م:۲۰۱۳ء] کی قیادت میں ایک بنچ نے ہندو انتہا پسندوں کے گورو دمودر ساورکر [م:۱۹۶۶ء]، ایم ایس گولوالکر [م:۱۹۷۳ء] کی تصنیفات سے استدلال کرنے کے بجائے مولانا وحیدالدین خان کی تحریروں پر تکیہ کر کے 'ہندوتوا' کو نظریۂ زندگی قرار دے کر ہندو انتہا پسندی کو جواز فراہم کر دیا۔

اس کیس کی سماعت کے دوران ہی معروف قانون دان اے جی نورانی صاحب کی دلیل تھی کہ ''عدالت مولانا وحیدالدین خان کی تحریروں کی غلط تشریح کر رہی ہے''۔ ان کا کہنا تھا کہ ''مولانا اگر خود عدالت میں پیش ہو کر یا کسی تحریر کے ذریعے یہ موقف اختیار کریں، تو شاید کورٹ کو ساورکر یا ایم ایس گولوالکر کو ریفر کرنا پڑے گا''۔ عدالت کا یہ فیصلہ بہت دُوررس اہمیت کا حامل تھا۔ اسی فیصلے نے انتخابی جلسوں میں 'جے شری رام' کے نعروں کو جواز بخش کر بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیے ہندو ووٹروں کو لام بند کرنے کا کام کیا۔ اگرچہ مولانا وحیدالدین خان صاحب کا نجی محفلوں میں یہ موقف تو تھا کہ ''میری تحریروں کی غلط تشریح ہو رہی ہے''، لیکن اپنی تحریروں کی درست تعبیر و تشریح کے لیے کبھی کوئی عملی قدم انھوں نے کیوں نہیں اٹھایا؟ یہ معاملہ اُن کے دم واپسیں تک ایک راز ہی رہا۔ بقول نورانی صاحب اسی فیصلے کی وجہ سے بطور انعام جسٹس ورما کو دو سال بعد چیف جسٹس اور بعد میں قومی انسانی حقوق کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا اور اٹل بہاری واجپائی کی زیر قیادت بی جے پی حکومت نے مولانا وحیدالدین صاحب کو ۲۰۰۰ء میں تیسرا اعلیٰ سویلین ایوارڈ 'پدما بھوشن' سے سرفراز کیا۔ جنوری ۲۰۲۱ء میں وزیراعظم نریندر مودی حکومت نے ان کو 'پدما وبھوشن' سے نوازا۔

ہندو فسطائی تنظیموں، خاص طور پر آر ایس ایس کے ساتھ ان کے خاصے دوستانہ تعلقات تھے۔ اگرچہ ایسے سماجی تعلقات رکھنا کوئی غلط بات نہیں ہے، مگر مولانا اس دوستی میں بہت دُور نکل گئے تھے۔ تقریباً بیس برس قبل آر ایس ایس کے ایک چوٹی کے لیڈر اور ویشوا ہندو پریشد کے جنرل سیکرٹری پروین بائی توگڑیا سے گفتگو کرتے ہوئے ایک بار میں نے پوچھا کہ ''مسلمان، جو بھارت کے مکین ہیں، ان کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' تو ان کا کہنا تھا کہ ''مسلمانوں سے ہم کو کوئی شکایت نہیں ہے، اگر وہ ہندو جذبات کا خیال رکھیں''۔ میں نے پوچھا کہ ''ہندو جذبات سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' ان کا کہنا تھا کہ ''ہندو کم و بیش ۳۲ کروڑ دیوی دیوتاؤں پر

یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی ناک کا مسئلہ نہیں کہ ہم پیغمبر اسلام کی بھی اسی طرح عزت افزائی کریں۔ مگر مسلمان اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں، اور نہ اپنے یہاں کسی ہندو دیوی دیوتا کی تصویر یا مورتی رکھتے ہیں''۔ اپنے دفتر کی دیوار پر بابا گورو نانک اور گورو گوبند سنگھ کی لٹکتی تصویر اور کونے میں مہاتما بدھ اور مہاویر کی مورتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''یہ دیکھو، دوسرے مذاہب، یعنی سکھوں، بدھوں اور جینیوں نے ہندوؤں کے ساتھ رہنے کا سلیقہ سیکھا ہے، جو مسلمانوں کو بھی سیکھنا پڑے گا''۔

گجرات فسادات کے بعد ۲۰۰۲ء میں، ایک مسلم وفد آر ایس ایس کے اُس وقت کے سربراہ کے ایس سدرشن [م: ۲۰۱۲ء] سے ملنے، ان کے صدر دفتر ناگ پور گیا، جس میں اعلیٰ پایہ کے مسلم دانش ور شامل تھے۔ ملاقات کا مقصد ملک میں بڑھتی ہوئی نسل پرستی کو کم کرنے کے لیے اُن کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر رکھنا تھا۔ اس وفد کے ایک رکن کے بقول ''جب ہم نے سدرشن صاحب سے پوچھا کہ کیا مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفاہمت نہیں ہوسکتی ہے؟ اور کیا رسہ کشی کے ماحول کا جواب، دوستانہ ماحول سے نہیں دیا جاسکتا ہے؟'' تو اس کے جواب میں کے سدرشن صاحب نے مسلم وفد کو بتایا ''آر ایس ایس جیسی شدت پسند تنظیم مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرسکتی ہے، لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ لوگ (مسلمان) کہتے ہو کہ اسلام ہی برحق اور سچا دین ہے۔ آپ ایسا کہنا چھوڑ دیجیے اور کہیے کہ اسلام بھی برحق اور سچا دین ہے تو ہماری آپ کے ساتھ مفاہمت ہوسکتی ہے''۔ 'اسلام ہی حق ہے' کے بجائے اسلام بھی حق ہے، کا مطالبہ کرنا بظاہر ایک معمولی بات ہے اور یہ مطالبہ اب فرقہ پرست ہی نہیں، بلکہ خود ساختہ لبرل مسلمانوں کی طرف سے بھی کیا جانا شروع ہو چکا ہے۔ مگر غور کرنے کا مقام ہے کہ اس مطالبے کو ماننے سے خود ایمان کی بنیادوں کا کیا حشر ہوگا! آر ایس ایس کی ایسی فکری یلغار کا جواب دینے کے لیے مولانا وحیدالدین خان صاحب نے کیا کبھی کوئی عملی قدم اُٹھایا؟ یہ بات اسلامیانِ ہند کے علم میں نہیں ہے۔

مولانا وحیدالدین، سہل اور سائنسی اندازِ تحریر اور امن و امان پر زور صرف کرنے کی وجہ سے بھارتی میڈیا کے بھی لاڈلے تھے۔ جب کبھی ادارتی صفحات کے ایڈیٹروں کو اسلام کے حوالے سے مضمون کی ضرورت ہوتی تو ان کی جانب سے حکم ملتا تھا کہ ''مولانا وحیدالدین سے رابطہ

کر کے ان سے مضمون لکھوایا جائے''۔ اگر کبھی مولانا کے بجائے میں ان کے فاضل صاحبزادے اور ملّی گزٹ کے ایڈیٹر ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صاحب کا نام تجویز کرتا تو ادارتی صفحے کے انچارج پارساوینکٹیشورا راوہ اور مونو بینا گپتا، انکار کرتے ہوئے مولانا ہی کے مضمون پر اصرار کرتے تھے۔

اپنی تعلیم ختم ہونے کے بعد میں نوکری کی تلاش میں تھا، تو ایک دن خان صاحب سے درخواست کی کہ اردو اخبار قومی آواز میں رپورٹر کی جگہ خالی ہے، شاید آپ کی سفارش سے کام بن جائے، تو ان کا جواب تھا کہ ''کبھی اردو اخبار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا''۔ انھوں نے کہا کہ ''کسی انگریزی اخبار میں اگر چپراسی کی بھی نوکری کرنی پڑے تو اس کو فوقیت دینا''۔ اسی طرح ایک بار علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر سیّد حامد [م: ۲۰۱۴ء] اور مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی [م:۱۹۹۹ء] نے ملک گیر سطح پر چندہ جمع کر کے مسلمانوں کے ایک قومی انگریزی اخبار کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار One Nation Chronicle اور بعد میں ماہ نامہ کی صورت میں Nation and The World کے نام سے منظر عام پر آ کر غروب بھی ہو گیا۔ تاہم، اس کی تیاری کے دوران میں نے اس پرچے میں ملازمت کے لیے مولانا صاحب سے سفارش کی درخواست کی۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ ''یہ اخبار زیادہ دیر چلنے والا نہیں ہے۔ بس انگریزی مین اسٹریم میڈیا کا دامن تھام کر جرنلزم کی سیڑھیاں طے کر لو''۔ سوچتا ہوں کہ ان کا مشورہ نہایت ہی مناسب تھا۔

وہ مسلم مخالف ہندو تنظیموں اور مسلمانوں کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ ہو سکتے تھے اور شاید وہ کوئی بڑا رول بھی ادا کر سکتے تھے، مگر افسوس، اکثر معاملات میں وہ خاصے دُور چلے گئے تھے۔ جس میانہ روی کی وہ تلقین کرتے تھے، وہ خود ان کے ہاں موجود نہیں تھی۔ کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے موقف کی آبیاری کے لیے بی جے پی کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور اپنے دعووں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کرتے تھے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ دعا ہے کہ اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کر کے، ان کی مغفرت فرمائے۔